امام ابو عبیدؒ کا کتاب "الاموال" میں فقہی اقوال کے درمیان ترجیح کا منہج

Imam Abu Ubaid's approach towards declaring the preferred one amongst the Jurisprudential rulings in Kitab "Al-Amwal"

Abdul Ghaffar
PhD Research Scholar, Department of Islamic Studies
Allama Iqbal Open University, Islamabad
Email: gilgitiabdul@gmail.com
Prof. Dr. Shah Moeen ud Din Hashmi
Chairman, Department of Character Studies
Allama Iqbal Open University, Islamabad
Email: moeen.uddin@aiou.edu.pk

Abstract
Imam Abu Ubaid was one of the greatest/renowned jurist and Imam of his time in the field of Islamic Fiqh. He has written multiple books on various subjects of Islamic Fiqh. Among them, Al-Amwal stands on a higher rank among scholars. In this book, Imam Abu Ubaid argues from the different sources like the Quran, Sunnah, Sirat and various historical incidents. He sometimes develops his own opinion, disagreeing from his contemporary and early scholars by building strong premises over a certain matter. He also adds the opinions of other jurists to analyze the rulings comprehensively and prefers some of them on the bases of arguments and principles. While doing so, he illustrates the reasons behind his preference. This research article focuses on these reasons to evaluate them critically and to spread the sense and taste of jurisprudential arguments among scholars.
Keywords: preference, reasons, Fiqh, Islamic Jurisprudence, Imam Abu Ubaid, Methodology

امام ابو عبیدؒ قاسم بن سلام (م: ۲۲۴ھ) کو جہاں دیگر علوم و فنون میں مہارت حاصل تھی وہاں علم فقہ میں انہیں نمایاں مقام حاصل تھا بلکہ فقہ کے علم میں وہ مجتہد تھے اور ان کا موازنہ دیگر بڑے فقہا کے ساتھ کیا جاتا تھا جیسا کہ اسحاق بن راہویہؒ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو حق بات پسند ہے اور (حق یہ ہے کہ) امام ابو عبیدؒ مجھ سے زیادہ فقہ کو جاننے والے ہیں، نیز یہ کہ ہم امام ابو عبید کے محتاج ہیں اور وہ ہمارے محتاج نہیں[1]۔

ذہبیؒ کہتے ہیں کہ ابو عبیدؒ فقیہ، مجتہد امام اور سمندر رہیں[2]۔ نیز وہ کہتے ہیں کہ امام ابو عبیدؒ مجتہدین ائمہ میں سے ہیں[3]۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ ابو عبیدؒ اجتہاد کرتے تھے، کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے[4]۔

ابن تیمیہؒ کے مطابق ابو عبیدؒ چار ائمہ میں سے ایک تھے جو کہ امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام اسحاقؒ اور امام ابو عبیدؒ ہیں اور ابو عبیدؒ کو علم فقہ، لغت اور تاویل میں ایسی پہچان حاصل تھی جس کو بیان کرنے ضرورت نہیں[5]۔

امام ابو عبیدؒ کی مختلف علوم و فنون میں جن متعدد تصنیفات کو شہرت حاصل ہوئی ان میں کتاب "الاموال" سر فہرست ہے بلکہ یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ اسلام کے مالیاتی نظام یعنی زکات، صدقات، فے، جزیہ، خراج اور خمس وغیرہ کے احکام پر مشتمل امام ابو عبیدؒ کی کتاب "الاموال" اپنی نوعیت کی پہلی جامع تصنیف ہے۔ اگرچہ امام ابو یوسفؒ کی کتاب الخراج اور یحییٰ بن آدمؒ کی کتاب الخراج کا موضوع بھی اسلام کا مالیاتی نظام ہے مگر ابو عبیدؒ کی کتاب میں جس قدر تفصیلی مواد ہے وہ ان دونوں کتابوں میں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابو عبیدؒ کی کتاب "الاموال" کو امام ذہبیؒ نے علم فقہ میں ایک بہترین اور عمدہ کتاب قرار دیا ہے[6]۔

ابو عبیدؒ کی کتاب "الاموال" فقہی کتابوں میں شمار ہوتی ہے تاہم اس میں ان کا منہج محدثانہ بھی ہے کہ وہ ایک عنوان قائم کرنے کے بعد پہلے مختلف احادیث، سیرت کے واقعات اور تاریخی روایات کو ذکر کرتے ہیں، اس کے بعد اس سے فقہی مسئلے کا استخراج و استنباط کرتے ہیں۔ کبھی وہ فقہی حکم کو ذکر کرنے کے بعد اس سے متعلقہ روایات کو بعد میں ذکر کرتے ہیں۔ احکام فقہیہ کے استنباط کے اس عمل میں وہ کسی مخصوص امام کی تقلید نہیں کرتے بلکہ اپنے اجتہاد کی بنا پر کبھی وہ کسی امام کے ساتھ اختلاف کرتے ہیں تو کبھی کسی امام کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ امام ابو عبیدؒ کی کتاب میں چاروں مشہور فقہ کے ائمہ کرام کے علاوہ صحابہ کرامؓ کے اقوال کے، تابعینؒ کے اقوال اور دیگر علما و فقہا کے اقوال بھی ملتے ہیں، اس طرح امام ابو عبیدؒ کی یہ کتاب ان مسالک اور اقوال پر بھی مشتمل ہے جو بعد میں رائج نہ ہو سکے۔ بہر حال اختلاف و اتفاق کے اس فقہی عمل کے دوران امام ابو عبیدؒ دیگر فقہاے کرام کے اقوال اور ان کے دلائل کو ذکر کرتے ہیں، ان پر مناقشہ کرتے ہوئے اپنی رائے کو یا کسی قول کو ترجیح دیتے ہیں تو اس کے لئے عموماً وہ ترجیح کے وجوہات کو بھی ذکر کرتے ہیں۔

زیر نظر مقالے میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ امام ابو عبیدؒ کا مختلف فقہی اقوال میں ترجیح دینے کا منہج کیا ہے؟ یعنی کن وجوہات کی بنا پر وہ کسی قول کو ترجیح دیتے ہیں؟

ترجیح کی وجوہات

امام ابو عبیدؒ جب مختلف فقہی اقوال اور مذاہب میں کسی قول یا مذہب کو یا اپنی رائے کو ترجیح دیتے ہیں تو اکثر و بیشتر اس ترجیح کی وجہ کو بھی بیان کرتے ہیں۔ ان کی اہم ترجیح کی وجوہات درج ذیل ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کے قول کا اتباع

مختلف اقوال و مذاہب میں کسی قول کو ترجیح دینے کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس قول میں حضور اکرم ﷺ کے کسی فرمان کی پیروی ہو رہی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے "زمین سے پیدا ہونے والے غلہ جات اور پھلوں کی

زکات نیز ان پر عشر یا نصف عشر واجب ہونے کا بیان" کے نام سے باب کا عنوان باندھا ہے۔ اس باب میں انہوں نے مجموعی طور پر چار مختلف اقوال بیان کئے ہیں۔

۱۔ پہلا قول یہ ہے کہ پیداوار کی زکات یعنی عشر یا نصف عشر صرف گیہوں، جو، کھجور (کے درختوں) اور انگور پر لازم ہے۔ ان حضرات کا تمام تر اعتماد احادیث و آثار پر ہے کہ وہ بلا کسی کمی اور بیشی کے صرف انہی کی اتباع کرتے ہیں اور اس سے ذرا بھی تجاوز نہیں کرتے[7]۔

اس قول کی نسبت امام ابو عبیدؒ نے ابن ابی لیلیٰؒ اور سفیان بن سعیدؒ کی طرف کی ہے اور ان کی طرف سے دلیل کو ذکر کیا ہے۔ نیز یہ کہ حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ کا بھی یہی فتویٰ رہا ہے[8]۔

۲۔ دوسرا قول ان لوگوں کا ہے جو اس میں "سلت" صرف سفید بغیر چھلکے والے جو اور جوار (مکئی) کا اضافہ کرتے ہیں۔ ان حضرات کی تاویل یہ ہے کہ یہ دونوں غلے گیہوں کی جنس سے ہیں۔ اگرچہ گیہوں کھانے میں ان سے افضل ہے۔ ان کی اس رائے کی تائید حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ جب ان سے دریافت کیا گیا کہ سلت یعنی بغیر چھلکے والے سفید جو کو گیہوں یا گیلے سلت کے عوض دیا جا سکتا ہے؟ تو انہوں نے اس امر کو ناپسند کیا[9]۔

امام ابو عبیدؒ نے اس قول کی نسبت حضرت ابن عباسؓ اور ابراہیم نخعیؒ کی طرف کی ہے[10]۔

۳۔ تیسرا قول ان لوگوں کا ہے جو غلے کی تمام اقسام پر زکات کو واجب سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے جب سود سے متعلق چیزوں کا ذکر فرمایا تو ان میں سے صرف چھے چیزوں کو معین طور پر نام لیا یعنی سونا، چاندی، گیہوں، جو کھجور اور نمک[11]۔ لیکن بعد ازاں علما نے تمام ناپی اور تولی جانے والی چیزوں کو اسی سنت پر قیاس کیا۔ اسی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے جب دیکھا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی سنت زکات میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے گیہوں، جو، کھجور اور کشمش کی چار اصناف ہی کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ یہی وہ تین چیزیں ہیں جنہیں لوگ کھانے کے لئے جمع کیا کرتے تھے۔ اس وجہ سے ہم نے اسی فہرست میں ان بقیہ کھائے جانے والے غلوں اور پھلوں کو شامل کیا جو ان سے ملتے جلتے ہیں اور جو انہیں چاروں کی طرح ناپے اور تولے جانے میں ایک حکم رکھتے ہیں۔

اس قول کی نسبت امام مالکؒ کی طرف کرنے کے بعد امام ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ یہی قول اوزاعیؒ کا ہے اور ابن ابی لیلیٰؒ اور سفیانؒ (ثوری) کے علاوہ تمام اہل عراق کا بھی۔ تاہم امام مالکؒ اس قسم کے غلہ کی زکات کے بارے میں اوزاعیؒ اور اہل عراق سے بھی زیادہ سخت اور اس بات کے قائل ہیں کہ غلہ کی تمام مختلف اصناف کو ملا کر دیکھتے ہیں کہ اگر ان کا وزن پانچ وسق[12] ہو گیا تو اس پر زکات لازم کہتے ہیں جبکہ اہل عراق ہر صنف کے جداگانہ پانچ وسق ہونے پر زکات کے قائل ہیں[13]۔

۴۔ چوتھا قول یہ ہے کہ کشمش کو نکال کر صرف گیہوں، جو اور کھجور پر زکات لازم ہے۔ اس قول کے قائلین کا کہنا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے عربوں کو صرف انہی چیزوں کے بارے میں حکم دیا تھا جو ان کے شہریوں اور دیہاتیوں کی خوراک اور روزی کے سلسلے میں جانی پہچانی جاتی تھیں۔ یہ صرف تین اصناف تھیں، گیہوں اور جو شہریوں کے لئے جبکہ کھجور دیہاتیوں کے لئے۔ اس لحاظ سے کشمش خارج ہو جاتی ہے[14]۔

اس قول کی نسبت امام ابو عبیدؒ نے شریحؒ اور شعبیؒ کی طرف کر دی ہے[15]۔

پھر چاروں اقوال کے بارے میں امام ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ الغرض ان اقوال میں سے ہر قول کا قائل اپنے لئے کچھ دلائل اور جواز کی وجوہات رکھتا ہے جن کا ہم نے ان کی طرف سے اظہار کیا، واللہ اعلم ان کا منشا کیا تھا۔ پھر پہلے قول کو ترجیح دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تاہم مجھے ان میں سے اللہ کے رسول ﷺ کی سنت کی پیروی پر مبنی قول پسند ہے یعنی یہ کہ زکات صرف انہیں چار اصناف پر واجب ہو گی جن کو آپ ﷺ نے نام لے کر بہ طور سنت متعین فرما دیا ہے اور اس کی تائید صحابہؓ و تابعین کے اقوال سے ہو رہی ہے۔ پھر یہی مسلک ابن ابی لیلیٰؒ اور سفیانؒ (ثوری) نے بھی اختیار کیا ہے[16]۔

بہر حال اس بحث سے امام ابو عبیدؒ کا مختلف فقہی اقوال میں ترجیح دینے کا ایک منہج یہ معلوم ہوا کہ وہ اس قول کو اختیار کرتے ہیں جس کے مطابق حدیث کی پیروی ہو رہی ہو بالخصوص جب اس قول کی تائید صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور ائمہ کے اقوال سے بھی ہو رہی ہو۔

دو مختلف مدلل اقوال پر عمل کی صورت کو ترجیح

کبھی کسی قول کو ترجیح دینے کی یہ وجہ ہوتی ہے کہ اس میں دو مختلف صورتوں پر عمل ہوتا ہے جس میں سے ہر صورت کے لئے کوئی نہ کوئی دلیل ہوتی ہے۔

امام ابو عبیدؒ نے عنوۃً (بہ زور طاقت) مفتوحہ علاقوں سے متعلق دو طرح کے احکام ذکر کرتے ہوئے پہلے دو اقوال بیان کئے ہیں پھر آگے چل کر انہوں نے صراحت کے ساتھ تین اقوال نقل کئے ہیں۔

۱۔ پہلا قول یہ ہے کہ ایسی زمینوں کو تقسیم کیا جائے گا جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے خیبر کے موقع پر کیا۔ حضرت بلالؓ اور حضرت زبیرؓ بن عوام کی یہی رائے تھی[17]۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان علاقوں کو نسلاً بعد نسل تمام مسلمانوں پر بہ طور فے وقف قرار دیا جائے اور یہ رائے حضرت علیؓ بن ابی طالب اور حضرت معاذؓ بن جبل کی ہے[18]۔

۳۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس طرح کی زمینوں کا معاملہ امام کی مرضی پر منحصر ہے کہ چاہے تو غنیمت قرار دے دے اور پانچ حصے کر کے (چار حصے فاتحین میں) تقسیم کر دے یا انہیں تمام مسلمانوں پر وقف اور فے قرار دے کر تقسیم نہ کرے۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ نے سواد عراق کے علاقوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا۔ یہ رائے سفیان بن سعیدؒ کی ہے[19]۔

تقسیم کرنے اور نہ کرنے سے متعلق دونوں اقوال کے قائلین کی طرف سے مختلف روایات و واقعات سیرت سے استدلال کرنے کے بعد امام ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ پانچ حصے کر کے تقسیم کرنے کے قائلین سورہ انفال کی آیت غنیمت سے استدلال کرتے ہیں[20] اور تقسیم نہ کرنے کے قائلین سورہ حشر کی آیت سے استدلال کرتے ہیں[21]۔ نیز تقسیم کرنے سے متعلق نبی اکرم ﷺ کا عمل ہے تو تقسیم نہ کرنے سے متعلق حضرت عمرؓ کا عمل ہے۔ اس لئے امام ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ غنیمت اور فے قرار دئے جانے سے متعلق ان دونوں فیصلوں اور حکموں میں اقتدا اور اتباع کا نمونہ ہے، یعنی کسی بھی رائے کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

تاہم امام ابو عبیدؒ کے خیال میں ترجیح اس بات کو حاصل ہے کہ اس طرح کی زمینوں کا معاملہ امام کی صواب دید پر چھوڑا جائے جیسا کہ سفیان بن سعیدؒ کا قول ہے کیوں کہ اس طرح تقسیم کرنے اور تقسیم نہ کرنے کی دونوں صورتیں جمع ہوتی ہیں۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا عمل حضرت عمرؓ کے عمل کے معارض نہیں ہے، نبی اقدس ﷺ نے قرآن کریم کی ایک آیت کی پیروی کر کے اس پر عمل کیا تو حضرت عمر نے دوسری آیت پر عمل کر کے اس کی پیروی کی اور دونوں ہی آیات محکم ہیں[22]۔

الغرض اس بحث سے امام ابو عبیدؒ کا منہج یہ معلوم ہوا کہ وہ مختلف فقہی اقوال میں اس قول کو ترجیح دیتے ہیں جس میں دو مختلف صورتوں کے دونوں احکام جمع ہوتے ہیں۔

جمہور کے قول یا اجماع پر عمل

کبھی کسی قول اور رائے کو ترجیح دینے کی وجہ امام ابو عبیدؒ کے نزدیک یہ ہوتی ہے کہ وہ جمہور کا قول ہوتا ہے یا اس پر اجماع ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر "تجارتی سامان اور قرضوں پر زکات اور ان پر واجبات کا بیان" کے نام سے امام ابو عبیدؒ نے ایک جگہ باب باندھا ہے اور اموال تجارت سے متعلق مختلف روایات اور فقہی احکام کو ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان جملہ روایات کے بہ موجب سفیان بن سعیدؒ اور اہل عراق اس بات کے قائل ہیں کہ تجارتی سامان کی قیمت متعین کر کے اسے بقیہ مال میں ملایا جائے گا (پھر سب کی زکات ادا کی جائے گی)۔ مالک بن انسؒ بھی ایسے مال تجارت کے لئے جس

کو گھمایا جائے اور اس کے مالک کو قابل ادائی زکات نقد رقم کی صورت میں نہ ملتی ہو یعنی سامان کے عوض سامان ہی آتا رہتا ہو، ایسی ہی رائے رکھتے ہیں۔

تاہم امام مالکؒ کا کہنا ہے کہ رہا وہ سامان تجارت جو برسوں سے اس کے مالک کے پاس پڑا رہا ہو تو اس پر اس کے بیچنے سے پہلے کچھ زکات ادا کرنا لازم نہیں اور جب وہ فروخت ہو جائے تو اس کی قیمت پر صرف ایک (سال ہی کی) زکات دے گا۔ یہ اس لئے کہ اس مالک پر یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی مال کی زکات اس مال کے علاوہ کسی اور مال میں سے دے۔

پھر امام مالکؒ کے برعکس وہ دیگر ائمہ کی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہی بات درست ہے جو سفیان بن سعید اور اہل عراق کی ہے یعنی یہ کہ تجارتی سودے کے نقد رقم میں تبدیل ہونے یا تبدیل نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسی کی تائید صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کی متواتر روایات سے ہوتی ہے۔ ان سب کا اس پر اجماع ہے کہ موجودہ مال کو بقیہ تمام نقدی میں شامل کیا جائے گا۔ پھر اگر یہ مجموعہ اتنا زیادہ ہو جائے کہ اس پر زکات لازم ہوتی ہو تو مالک اس کی زکات ادا کرے گا۔ پھر امام ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ ہمارے علم میں ایسا کوئی عالم نہیں جس نے امام مالکؒ سے پہلے تجارتی سامان کے نقدی میں تبدیل ہونے یا تبدیل نہ ہوے میں فرق کیا ہو[23]۔

اس کے بعد امام ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ ایک فقہ میں کلام کرنے والے نے کہا ہے کہ تجارتی اموال پر زکات واجب نہیں۔ اس بات پر اس کا استدلال یہ ہے کہ جو حضرات تجارتی مال پر زکات کو واجب سمجھتے ہیں وہ اسی وقت زکات کو واجب قرار دیتے ہیں جب اس مال کی قیمت کا تعین ہو جائے۔ پھر وہ کہتا ہے: "ہر مال پر خود اسی میں سے زکات واجب ہوتی ہے اور قیمت سامان کے علاوہ کوئی اور چیز ہے"۔ یوں اس تاویل کی بنا پر وہ اس مال تجارت سے زکات کو کالعدم قرار دیتا ہے۔

اس قول کو مسترد کرتے ہوئے امام ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ ہمارے خیال میں اس نے نتیجہ نکالنے میں غلطی کی ہے۔ اس لئے کہ ہمیں اللہ کے رسول ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کے اصحاب کے طریقے میں یہ ملتا ہے کہ زکات کا حق تو یہی ہے کہ وہ جس مال پر لاگو ہو رہی ہو اسی میں سے لے لی جائے، لیکن پھر وہ ایسی صورت میں منتقل ہو جاتی ہے جس کی ادائیگی زکات دینے والے کو اصل مال کی نسبت زیادہ آسان ہو جائے۔

اسی مضمون کو اللہ کے رسول ﷺ کا وہ مکتوب گرامی واضح کر رہا ہے جو آپ نے جزیہ کی ادائیگی کے سلسلہ میں حضرت معاذؓ کو یمن بھیجا تھا کہ ہر بالغ مرد سے ایک دینار یا اس کے مساوی یمنی کپڑا (جزیہ میں) لیا جائے[24]۔ یوں رسول اکرم ﷺ نے نقد رقم کی بجائے (جزیہ میں) مال تجارت بھی لے لیا۔

پھر آپ ﷺ نے نجران کے لوگوں کے لئے یہ لکھ بھیجا[25] کہ ان لوگوں کو سالانہ دو ہزار جوڑے دینے ہوں گے یا اس کے مساوی اوقیہ[26]۔ اس طرح اللہ کے رسول ﷺ نے مال تجارت کی بجائے نقد رقم بھی لے لی۔

حضرت عمرؓ جزیہ میں اونٹ لے لیا کرتے تھے۔ حالانکہ بنیادی طور پر سونے یا چاندی کی صورت میں وصول کیا جانا چاہئے اور حضرت علیؓ نے بھی جزیہ میں سوئیاں، رسیاں اور رسوئے لئے ہیں[27]۔

حضرت معاذؓ سے خود زکات کے بارے میں یہ مروی ہے کہ انہوں نے زکات کو نقد لینے کی بجائے اس کے عوض مال تجارت لے لیا۔ اس کا اظہار ان کے اس قول سے ہو رہا ہے: "تم میرے پاس یمنی چادریں، یا دھسے لے آؤ تو میں بجائے نقد زکات کے تم سے یہ چیزیں لے لوں گا۔ اس لئے کہ تمہیں ان کے دینے میں آسانی ہوتی ہے اور یہ اشیاء مدینہ میں مہاجرین کے لئے زیادہ نفع بخش ہیں[28]۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ ان کی بیوی نے ان سے کہا کہ میرے پاس ایک گلوبند ہے جس میں بیس مثقال (سونا) ہے۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ اس کی زکات پانچ دراہم ادا کرو[29]۔

اس کے بعد امام ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ یہ تمام مثالیں ایسی چیزوں کی ہیں جن پر زکات واجب ہوتی ہے اور پھر زکات ان اموال کی بجائے دوسرے اموال میں سے لی گئی ہے۔ اور اس بنا پر کہ خود ان چیزوں میں سے زکات نہیں دی جا سکتی ان سے زکات ساقط نہیں کی گئی۔ کیونکہ زکات ایک نہ ٹلنے والا حق ہے جسے کوئی چیز زائل نہیں کر سکتی۔ یہ الگ بات ہے کہ زکات دینے والا ان اشیاء کو محفوظ و سالم رکھنے کی غرض سے ان میں سے نہیں بلکہ دیگر اموال سے ان پر واجبی حق ادا کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ یہ صورت اموال تجارت کی ہے کہ بنیادی طور پر تو ان کی زکات خود انہی میں سے لینا چاہئے لیکن اس صورت میں اس مال کے کٹنے، ٹوٹنے اور کچھ اجزاء کم ہونے سے مالکان کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہے۔ اس وجہ سے ان کو اجازت دے دی گئی کہ وہ قیمت کا تعین کر کے اس کے لحاظ سے زکات نکال دیں۔

اب اگر کوئی ایسی صورت ہو کہ کسی شخص کے مال تجارت پر زکات واجب ہوتی ہو اور اس کی قیمت کا تعین پورے ایک بیل یا ایک جانور یا ایک غلام کی قیمت کے برابر ہو جائے اور وہ بعینہ اس پوری چیز کو اپنے مال کی زکات میں ادا کر دے تو ہماری نظر میں وہ زکات ادا کرنے کے ساتھ ساتھ احسان کرنے والا بھی ہو گا اور اگر اس پر یہ آسان ہوتا ہو کہ وہ اس متعین رقم کے عوض سونا یا چاندی دے دے تو اسے اس کی بھی اجازت ہو گی۔

پھر امام ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ یہ ہے تاجروں کے اموال پر زکات نکالنے کے بارے میں ہماری رائے اور اسی پر تمام مسلمانوں کا اتفاق و اجماع ہے کہ اموال تجارت پر زکات ایک اٹل فریضہ ہے۔ اب رہا (اس کے برخلاف) دوسرا قول، تو ہمارا خیال یہ ہے کہ علما میں سے کسی نے بھی وہ مسلک اختیار نہیں کیا[30]۔

نیز سونا، چاندی نصاب سے زائد ہو تو اس میں سے زکات لینے کے طریقہ کار کے حوالے سے امام ابو عبیدؒ تین اقوال ذکر کرتے ہیں:

۱۔ پہلا قول یہ ہے کہ ہر بیس دینار پر آدھا دینار، ہر چالیس دینار پر ایک دینار اور ہر دو سو درہم پر پانچ درہم کے حساب سے زکات ادا کی جائے گی اور اس سے زائد مقدار پر اسی حساب سے زکات دے دی جائے گی[31]۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ دو سو دراہم میں سے پانچ درہم وصول کیا جائے اور دو سو دراہم سے زیادہ ہونے کی صورت میں ہر چالیس درہم پر ایک درہم کے حساب سے زکات لی جائے[32]۔

۳۔ تیسرا قول یہ نقل کیا ہے کہ دو سو سے اوپر دراہم پر کوئی زکات نہیں لی جائے گا جب تک کہ چار سو نہ ہو جائیں، پھر اس وقت ان پر دس دراہم لئے جائیں گے اور پھر اس سے مزید بڑھنے پر اس وقت تک کچھ نہیں لیا جائے گا جب تک چھے سو دراہم نہ ہو جائیں اور یہی سلسلہ جاری رہے گا[33]۔

ان تینوں اقوال اور اس سے متعلقہ روایات کو بیان کرنے کے بعد امام ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ قول اول جو حضرت علیؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، ابراہیم نخعیؒ اور عمر بن عبد العزیزؒ کی طرف منسوب ہے تو ہمارے ہاں اسی پر عمل ہو رہا ہے اور مسلمانوں کی اکثریت اسی کی قائل ہے اور یہی ابن ابی لیلیٰؒ، سفیانؒ اور امام مالکؒ کا قول ہے[34]۔

بہر حال اس بحث سے معلوم ہوا کہ امام ابو عبیدؒ اس قول کو ترجیح دیتے ہیں جس پر اجماع ہو یا جو جمہور کا قول ہو۔

کسی قول کا حدیث کے مفہوم کے زیادہ قریب ہونا

امام ابو عبیدؒ کے نزدیک مختلف فقہی اقوال میں سے کسی ایک قول کو ترجیح دینے کی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ قول حدیث کے مفہوم کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر سونے یا چاندی کے جداگانہ مقدار نصاب سے کم ہونے پر زکات ادا کرنے کی صورت سے متعلق امام ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ اگر دراہم و دنانیر اس (نصاب کی) تعداد سے کم ہوں تو ان کی زکات سے متعلق پانچ اقوال ہیں:

۱۔ (پہلا قول) عبیدہؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابراہیمؒ (نخعی) سے پوچھا کہ اس شخص کی زکات کے بارے میں کیا حکم ہے جس کے پاس دو درہم ہوں اور دس دینار؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ ہر صنف میں سے بہ قدر حصہ اس کی زکات ادا کرے گا۔

۲۔ (دوسرا قول) یہی سوال جب شعبیؒ سے کیا تو انہوں نے کہا کہ جو صنف کم تر ہو اسے زیادہ والی کے مطابق (قیمت کا اندازہ لگا کر) حساب کرے گا۔ اگر وہ نصاب کی مقدار کو پہنچ جائے تو اس کی زکات ادا کرے گا۔

اس دوسرے قول کی وضاحت کرتے ہوئے امام ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ (چاندی یا سونے میں سے) جو صنف کم تر ہو گی، بازار کے موجودہ بھاؤ سے اس کی قیمت کا تعین کر کے (زیادہ مقدار والی صنف کی قیمت میں ملا کر) حساب کیا جائے گا۔

۳۔ تیسرا قول یہ ہے کہ جب دینار کی قیمت درہم میں شامل کرے تو ہر دینار کو دس درہم کے مساوی قرار دے، خواہ (موجودہ) بھاؤ اس سے کم تر ہو یا زیادہ ہو۔

۴۔ چوتھا قول یہ ہے کہ ہر حال میں دیناروں کی قیمت لگا کر دراہم میں جوڑی جائے، خواہ دینار دراہم سے کم ہوں یا زیادہ۔

۵۔ پانچواں قول یہ ہے کہ دونوں قسم کے مالوں پر سے زکات ختم کر دی جائے گی اور ان پر اس وقت تک کوئی زکات نہیں لگے گی تاوقتیکہ وہ جداگانہ (اپنے نصاب کی مقدار یعنی) دوسو دراہم اور بیس دینار نہ ہو جائیں[35]۔

پھر امام عبیدؒ ان اقوال پر تبصرہ کرتے ہوئے اور متعلقہ وجہ استدلال کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان میں سے ہر قول کا قائل اپنے لئے ایک وجہ استدلال رکھتا ہے۔

وہ شخص جو ہر صنف میں سے بہ قدر حصہ زکات کی ادائیگی کا قائل ہے وہ کہتا ہے کہ کسی مال پر اس کی انفرادی اور ذاتی حیثیت سے زکات واجب ہوتی ہے اور یہ نہیں ہو گا کہ اس پر جو حق واجب ہوتا ہو وہ اس سے منتقل ہو کر دوسرے پر واجب ہو جائے۔ بنابریں دونوں قسموں میں سے کسی ایک کو دوسری میں ضم نہیں کیا جائے گا۔ یہ ہے ابراہیم کی دلیل اور یہی مالک بن انس کا قول ہے۔

وہ شخص جو تھوڑی مقدار والی صنف کو زیادہ مقدار والی صنف میں ملانے کا قائل ہے وہ ان دونوں کو ایک مال قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ کہ میری رائے میں درہم اور دینار اشیاء کی قیمت ہیں۔ اشیاء کو ان دونوں کی قیمت نہیں کہا جاتا، لیکن بایں ہمہ میں دیکھتا ہوں کہ ان دونوں اصناف کو ایک دوسرے کے عوض ادھار فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ اس سے مجھے یہ ثبوت ملتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک ہی نوع ہیں۔ اس بنا پر میں کم تر صنف کی قیمت اس کے بھاؤ کے مطابق لگا کر زیادہ مقدار ہو والی صنف میں شامل کرتا ہوں۔ یہ امام شعبیؒ کا استدلال ہے اور ابن بکیر کی روایت تکے مطابق یہی امام اوزاعیؒ کا بھی قول ہے۔ اور یہی سفیان اور اہل عراق کا مسلک ہے۔

وہ شخص جو ملے جلے دینار اور دراہم کو بہر حال درہموں میں شامل کرنے کا قائل ہے، خواہ دینار دراہم سے زیادہ ہی کیوں نہ ہوں وہ اپنے مسلک پر یہ استدلال کرتا ہے کہ سنت میں تو صرف دراہم کی زکات ہی مذکور ہے اور یہ اللہ کے رسول ﷺ کی سنت سے ثابت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں نے دراہم سے مشابہت کی بنا پر ہی سونے پر

زکات واجب کر دی ہے۔ اس لئے میں دیناروں کو مال تجارت قرار دیتے ہوئے ان کی قیمت لگا کر اسے دراہم میں شامل کروں گا۔ یہ حدیث واثر کے قائلین میں سے بعض کا مسلک ہے۔ اس سے کچھ ملتا جلتا قول عطاء اور زہری سے مروی ہے کہ وہ دونوں دیناروں کو بہ منزلہ مال تجارت قرار دیتے تھے۔

رہا وہ شخص جو ہر دینار کو دس درہم کے مساوی قرار دیتا ہے اور اس کے موجودہ نرخ کے مطابق قیمت کو در خو اعتنا نہیں سمجھتا وہ اپنے مسلک پر یہ ثبوت پیش کرتا ہے کہ اصل نصاب میں ہر دینار دس درہم ہی کے مساوی رکھا گیا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جب تک دنانیر کی تعداد بیس نہ ہو جائے اس پر زکات واجب نہیں ہوتی۔ بالکل اسی طرح جیسے دراہم کی تعداد دو سو ہونے سے پہلے ان پر زکات واجب نہیں ہوتی۔ چنانچہ ان (دونوں کی مذکورہ تعداد کے بعد) یہ دونوں باہم دیگر مساوی ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ان میں سے ہر ایک پر چالیسواں حصہ واجب کیا گیا۔

امام ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ محمد بن حسنؒ کے سوا یہ قول میں نے کسی اور سے نہیں سنا۔ انہوں نے بتایا کہ اس مسئلہ میں میری رائے یہی ہے، لیکن ان کے ساتھ اس رائے میں ان سے اختلاف کرتے ہیں۔

اب رہ جاتا ہے وہ شخص جو اس طرح کے دونوں اموال پر سے زکات ختم کرنے کا قائل ہے اور کہتا ہے کہ زکات اسی وقت دی جائے گی جبکہ دراہم دو سو اور دنانیر بیس ہو جائیں۔ وہ بھی خود سنت سے استنباط کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ خود سنت نے ان دونوں اصناف میں فرق قائم رکھا ہے اور ان دونوں کو دو مختلف نوع قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے خود چاندی کو چاندی کے عوض ربا قرار دیا ہے الا یہ کہ وہ مساوی ہو۔ چنانچہ آپ ﷺ نے دونوں چاندیوں کو برابر قرار دیا کیونکہ وہ دونوں ایک نوع ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ نے سونے کو سونے کے عوض ربا قرار دیا (الا یہ کہ وہ برابر ہو) پھر آپ نے سونے کو اس سے کئی گنا زیادہ چاندی کے عوض جائز قرار دیا اس لئے کہ وہ دونوں مختلف انواع ہیں[36]۔

اس کا کہنا ہے کہ جب اللہ کے رسول ﷺ نے سونے اور چاندی کو دو جنس قرار دیا تو میں ان دونوں کو کیونکر اکھٹا کر کے ایک جنس بناڈالوں؟ یہ ابن ابی لیلیٰؒ اور، شریکؒ اور حسن بن صالحؒ کا قول ہے۔

ان اقوال میں سے آخری قول کو امام ابو عبیدؒ ترجیح دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہی قول میرے نزدیک احادیث و آثار سے زیادہ قریب اور نظری طور پر زیادہ صحیح ہے[37]۔

قیاس سے مطابقت

نیز امام ابو عبیدؒ مختلف فقہی اقوال میں سے اس قول کو ترجیح دیتے ہیں جو ان کے نزدیک قیاس کے زیادہ مشابہ ہو۔ مثال کے طور پر کانوں کی پیداوار سے زکات، دفینہ میں سے خمس لینے کے احکام اور اس بارے میں اختلاف

بیان کرتے ہوئے امام ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ کانوں کے متعلق عمر (بن عبد العزیزؒ) کی یہی رائے ہے کہ ان سے حاصل ہونے وال مال پر زکات لی جائے گی جیسا کہ قبلیہ کی روایت میں مذکور ہے[38]۔

عبد اللہ بن ابی بکر سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے کانوں (کی پیداوار) سے زکات لی۔

عبد اللہ بن ابی بکرؒ کہتے ہیں کہ عمر بن عبد العزیزؒ نے لکھا تھا کہ کانوں (کی پیداوار) سے زکات لو اور اس میں سے خمس نہ لو[39]۔

امام ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ یہی مالک بھی انس کی بھی رائے تھی جیسا کہ یحییٰ بن عبد اللہ بن بکیرؒ روایت کرتے ہیں کہ امام مالکؒ نے کہا کہ کان بہ منزلہ کھیت ہے۔ اس (کی پیداوار) سے اسی طرح زکات لی جائے گی جس طرح کھیت کاٹنے پر اس (کی پیداوار) سے زکات لی جاتی ہے۔ اور کان "رکاز" یعنی زمین میں مدفون خزانہ نہیں ہے۔ "رکاز" تو زمانہ جاہلیت کا وہ دفینہ ہے جو بغیر سرمایہ لگائے ہاتھ لگ جائے اور جس کے حاصل کرنے میں بڑی محنت نہ کرنا پڑے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ اور جب تک کان سے نکلنے والی شے کی مالیت بیس دینار یا دو سو درہم تک نہ پہنچ جائے اس میں سے کچھ نہیں لیا جائے گا۔ جب مذکورہ مالیت کو پہنچ جائے تو اس میں سے زکات لی جائے گی۔ اور جوں جوں پیداوار میں اضافہ ہو گا اسی حساب سے اس سے لیا جائے گا۔ یہ ایسی صورت میں کہ کان سے مسلسل پیداوار ہونے لگے تو اس کے ساتھ پھر پہلا عمل کیا جائے گا یعنی جس طرح پہلی مرتبہ زکات شروع کی گئی تھی اسی طرح از سر نو زکات شروع کی جائے گی۔

امام ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ یہ ہے مالک اور اہل مدینہ کی رائے۔ لیکن دیگر علما کی رائے میں "کان" بھی "رکاز" (دفینہ) میں شامل ہے اور جس طرح وہ غنیمت میں خمس لینے کے قائل ہیں اسی طرح وہ کان کی پیداوار میں سے بھی خمس لینے کے قائل ہیں۔

اس رائے کو ترجیح دیتے ہوئے امام ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ یہی موخر الذکر مسلک میرے نزدیک اس مرفوع حدیث کی تاویل سے زیادہ مشابہ ہے جسے ہم عبد اللہ بن عمروؓ کی سندے بیان کر چکے ہیں اور وہ یہ ہے کہ

"اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ اس مال کا کیا حکم ہے جو قدیم زمانہ کے ویرانہ میں ملے؟ تو آپ نے فرمایا: اس میں اور رکاز (زمین میں سے نکلنے والے مال) میں سے خمس یعنی پانچواں حصہ لیا جائے گا[40]"۔

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ رکاز زمین میں دبے ہوئے مال کے علاوہ کسی اور چیز کا نام ہے۔ اس لئے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس میں اور رکاز میں سے خمس لیا جائے گا۔ اس طرح آپ ﷺ نے رکاز کو اس مال کے علاوہ (جو قدیم ویرانے سے ملے) بتایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ "رکاز" سے مراد "کان" ہے۔

نیز یونسؒ کہتے ہیں کہ ابن شہاب (زہری) سے دفینہ (رکاز) اور "معادن" کانوں سے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ ان سب چیزوں سے حاصل ہونے والے مال پر خمس (پانچواں حصہ) لیا جائے گا[41]۔

اس کے بعد امام ابو عبیدؒ امام مالکؒ کے مقابلے میں دیگر علما کی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے نزدیک "نظر" یعنی قیاس کی رو سے بھی یہی درست ہے کہ کھیت (کی پیداوار) کے مقابلے میں دفینے اور کانوں کی پیداوار مال غنیمت سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ اس لئے کہ جس طرح کانوں سے مال نکالنے میں اخراجات اٹھانے پڑتے ہیں اور جان جوکھوں میں ڈالی جاتی ہے اسی طرح دشمن سے مقابلہ و جہاد میں بھی انہیں حالات سے گزرنا پڑتا ہے بلکہ جہاد زیادہ سخت اور خطرناک عمل ہے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کے حاصل کردہ مال غنیمت میں ان پر خمس (پانچواں حصہ) مقرر کیا ہے۔ اس لحاظ سے کانوں پر کم سے کم جو ٹیکس لگایا جاسکتا ہے تو اتنا تو ہونا چاہئے جو دشمن سے حاصل کردہ مال پر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ کھیتوں (کی پیداوار) اور سونے چاندی کے احکام الگ الگ ہیں۔ کھیتوں (کی پیداوار) پر تو کٹائی کے موقع پر صرف ایک بار ہی زکات لی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس غلہ وغیرہ پر کچھ نہیں لیا جاتا۔ خواہ وہ غلہ وغیرہ برسوں مالک کے پاس پڑا رہے لیکن اس کے برخلاف سونے چاندی پر جو نفع ہوتا ہے اس پر (فوری طور سے) کوئی زکات نہیں لی جاتی تا آنکہ ان پر ایک سال نہ گزر جائے۔ اور اس مدت کے بعد ہی سونے اور چاندی پر مسلسل ہر سال زکات ادا کی جاتی ہے۔

امام ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ ان وجوہات کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ ان ہر دو اشیاء (یعنی کھیت اور سونا چاندی) کے حکم میں نہ صرف اصل کے لحاظ سے اختلاف ہے بلکہ فرع کے لحاظ سے بھی اختلاف ہے۔ اس سے بھی زیادہ نمایاں فرق ان دونوں چیزوں میں یہ ہے کہ کھیت (کی پیداوار) سے عشر (دسواں حصہ) یا نصف عشر (بیسواں حصہ) زکات لی جاتی ہے جبکہ سونے اور چاندی سے ربع عشر یعنی چالیسواں حصہ زکات لی جاتی ہے۔ یہ بڑا نمایاں اور واضح فرق ہے جس کی موجودگی میں ہم کیسے معدن (سے نکالے ہوئے) مال کو کھیت (کی پیداوار) سے مشابہ سمجھ سکتے ہیں؟[42]

الغرض امام ابو عبیدؒ کے نزدیک کان سے حاصل ہونے والی پیداوار کھیت کی پیداوار کی طرح نہیں بلکہ اس کی مشابہت مال غنیمت سے زیادہ ہے، اس لئے اسے مال غنیمت پر قیاس کیا جانا چاہئے۔ جس طرح مال غنیمت پر خمس (پانچواں حصہ) ادا کرنا لازم ہے، اس طرح کانوں سے حاصل ہونے والی پیداوار پر بھی خمس واجب ہو گا۔

صحابیؓ کے قول سے موافقت

اس طرح امام ابو عبیدؒ مختلف فقہی اقوال میں سے اس قول کو ترجیح دیتے ہیں جو صحابیؓ کے قول سے موافقت رکھتا ہو۔ جیسا کہ انہوں نے ایک جگہ یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ زکات میں زیادہ سے زیادہ کتنی مقدار کسی شخص کو دی جا سکتی ہے؟" اس ضمن میں انہوں نے تین اقوال نقل کئے ہیں۔

۱۔ پہلا قول سفیانؒ (ثوری) کا ہے کہ وہ زکات میں کسی کو پچاس درہم سے زیادہ دینا ناپسند کرتے تھے، اسی طرح ان کی رائے یہ تھی کہ جو پچاس درہم کا مالک ہو اسے زکات نہیں دی جائے گی۔ اپنے اس فیصلے میں وہ صرف قرض دار کو مستثنیٰ قرار دیتے تھے اور ان کا قول تھا کہ ایسے شخص کا قرض ادا کر دیا جائے گا خواہ وہ اس مقدار سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔

اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے امام ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ یہ ایک مسلک ہے اور اس شخص کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ ہے جو اس پر عمل کرنا اور اس پر اتباع کرنا چاہتا ہے[43]۔

۲۔ دوسرا قول سفیان (ثوری) کے سوا دیگر بقیہ تمام اہل عراق کا ہے ان کا بھی مسلک یہی ہے البتہ انہوں نے اس رقم کا تعین (پچاس درہم کی بجائے) دو سو درہم کے ساتھ کیا ہے۔ اس بنا پر ان کا کہنا ہے کہ کسی سائل کو بھی دو سو (درہم) سے زیادہ نہیں دیا جائے گا۔ ایسے ہی اس کے پاس دو سو درہم ہوں تو اس کے لئے زکات لینا حلال نہ ہو گی۔ ضحاک بن مزاحمؒ سے بھی ایسا ہی قول مروی ہے۔

۳۔ تیسرا قول امام مالکؒ کا ہے کہ اس بارے میں کوئی معین حد نہیں ہے۔ ان کا قول تھا کہ میرے خیال میں دینے والے کو چاہئے کہ وہ اس بارے میں پوری چھان بین اور حسن نظر سے کام لے[44]۔

پھر امام ابو عبیدؒ نے امام مالک کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ سنت اتنی قید ضرور لگاتی ہے کہ جس کو زکات (وصدقہ) دیا جائے اگر اس کے پاس عطیہ سے پہلے ایک اوقیہ ہو تو وہ زکات کا مستحق نہیں لیکن جب اس کو دیا جا رہا ہو وہ فقیر اور زکات اور صدقات کا مستحق ہو تو ان آثار میں ہمیں کوئی ایسی دلیل نہیں ملتی جس کی بنا پر ہم عطیہ کی مقدار محدود کر سکیں۔ اس کے برخلاف (صحابہ کرامؓ سے) ہمیں ایسی روایات ملتی ہیں جن میں زیادہ دینے کی فضلیت ہے اور اسے پسندیدہ اور مستحب قرار دیا گیا ہے[45]۔

اس کے بعد امام ابو عبیدؒ نے زیادہ مقدار زکات دینے کے جواز کے بارے میں متعدد صحابہ کرامؓ سے روایات نقل کی ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ جراد بن شبیط کہتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ بن خطاب کے پاس تھا کہ ان کے پاس بہ ظاہر ایک ہٹا کٹا، کھاتا پیتا شخص آیا اور اس نے کہا کہ اے امیر المومنین! میں مر گیا اور میرے بال بچے بھی تباہ و برباد ہو گئے۔ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم میں سے ایک شخص گھی کے کُپے کی طرح چکنا چپڑا آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں مر گیا اور میرے بال بچے تباہ و برباد ہو گئے پھر اسے قریب بلاتے ہوئے حضرت عمرؓ نے اپنا واقعہ یوں بیان کیا کہ میں اور میری ایک بہن اپنے والدین کے ایک اونٹ کو جسے پانی بھرنے کے کام میں لایا جاتا تھا چراتے تھے۔ ہماری ماں اپنی تہمد ہمیں پہنا دیتی تھی اور ہمیں مٹھی مٹھی اندرائن کے بیج کھانے کے لئے دے دیا کرتی تھی۔ ہم اپنے اس اونٹ

کو لے کر نکلتے جب سورج نکل جاتا تو میں اپنی تہمد بہن کے پاس ڈال کر ننگا محنت کرنے لگتا۔ پھر ہم اپنی ماں کے پاس واپس جاتے اور وہ ہمارے لئے اندرائن کے بیجوں کا ہریرا تیار رکھتیں۔ کیا سرسبز و شاداب زمانہ تھا وہ۔ پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا اسے صدقہ کے جانوروں میں ایک ربیع میں پیدا ہونے والی اونٹنی (جو ایک سال سے کم عمر کی ہوتی ہے) دے دو۔ (راوی جراد بن شبیط کہتے ہیں کہ) چنانچہ میں نے دیکھا کہ وہ اونٹنی اس طرح نکلی کہ اس کے پیچھے اس کی ماں اور اس کا باپ دونوں آ رہے تھے۔ راوی کہتے ہیں کہ اس دن مجھے اس شخص پر جتنی جلن آئی اتنی جلد کبھی کسی پر مجھے نہیں آئی تھی[46]۔

امام ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہاں حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو تین اونٹ دے دئے ہیں اور یہ بڑی قیمت کا مال ہوتا ہے، انہوں نے یہ اس لئے کیا تھا کہ اسے تنگ دستی اور عیال داری سے نکال کر آسودہ کر دیں۔ کیونکہ اس نے بال بچوں کی تباہی کا ذکر کیا تھا اور حضرت عمرؓ کی رائے یہی تھی کہ جب دیا جائے تو آسودہ و تونگر کر دیا جائے۔

عمرو بن دینارؒ راوی ہیں کہ عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ جب تم دو تو تونگر و آسودہ کر دو[47]۔

امام ابو عبیدؒ مزید کہتے ہیں کہ بنابریں بعض تابعین اس طریقہ پر عمل پیرا تھے اور وہ تھوڑا دینے پر زیادہ دینے کو ترجیح دیتے تھے۔ اپنے موقف کی تائید اور امام مالکؒ کے مسلک کی تائید کرتے ہوئے آخر میں کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا قول زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے[48]۔

الغرض امام ابو عبیدؒ نے زیادہ سے زیادہ مقدار زکات دینے سے متعلق سفیان ثوری اور دیگر بقیہ اہل عراق کے مقابلے میں امام مالکؒ کو قول کو حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کے قول کے موافق ہونے کی وجہ سے ترجیح دی ہے۔

خلاصہ بحث

امام ابو عبیدؒ کو ایک فقیہ، مجتہد عالم دین تھے۔ انہوں نے اپنی فقہی کتاب "الاموال" میں احادیث، واقعات سیرت اور تاریخی روایات سے اسلام کے مالیاتی و اقتصادی پر مبنی فقہی مسائل کا استخراج و استنباط کیا ہے۔ انہوں نے اپنے فقہی رائے کو ظاہر کرنے کے ساتھ ائمہ اربعہ اور دیگر فقہاے کرام کے اقوال کو بھی اپنے کتاب میں جگہ دی ہے۔ امام ابو عبیدؒ مختلف فقہی اقوال کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے کسی ایک قول کو ترجیح دیتے ہیں تو عموماً وہ اس کی ترجیح کی وجہ بھی ذکر کرتے ہیں۔ ان کی اہم وجوہاتِ ترجیح درج ذیل ہیں:

1. نبی اکرم ﷺ کے قول کا اتباع
2. دو مختلف مدلل اقوال پر عمل کی صورت کو ترجیح

3. جمہور کے قول یا اجماع پر عمل
4. کسی قول کا حدیث کے مفہوم کے زیادہ قریب ہونا
5. قیاس سے مطابقت
6. صحابیؓ کے قول سے موافقت

حواشی وحوالہ جات

[1] خطیب، بغدادی، ابو بکر، احمد بن علی (م:۴۶۳ھ)۔ تاریخ بغداد۔ بیروت: دار الغرب الاسلامی۔ ط اول: ۱۴۲۲ھ-۲۰۰۲م۔ القاسم بن سلام ابو عبید۔ ج ۱۴، ص ۳۹۲۔

[2] ذہبی ابو عبد اللہ، محمد بن احمد، شمس الدین (م:۷۴۸ھ)۔ تذکرۃ الحفاظ۔ بیروت: دار الکتب العلمیۃ۔ ط اول: ۱۴۱۹ھ-۱۹۹۸م۔ الطبقۃ الثامنۃ۔ ج ۲، ص ۵۔

[3] ذہبی، ابو عبد اللہ، محمد بن احمد، شمس الدین (م:۷۴۸ھ)۔ سیر اعلام النبلاء۔ بیروت: موسسۃ الرسالۃ، ط سوم: ۱۴۰۵ھ-۱۹۸۵م۔ ابو عبید القاسم بن سلام۔ ج ۱۰، ص ۴۹۱۔

[4] ذہبی،، ابو عبد اللہ، محمد بن احمد، شمس الدین (م:۷۴۸ھ)۔ معرفۃ القراء الکبار علی الطبقات والاعصار۔ بیروت: دار الکتب العلمیۃ۔ ط اول: ۱۴۱۷ھ-۱۹۹۷م۔ ص ۱۰۱۔

[5] ابن تیمیہ، تقی الدین، ابو العباس، احمد بن عبد الحلیم (م ۱۲۸ھ) مجموع الفتاویٰ۔ المدینۃ النبویۃ: مجمع الملک فہد۔ سن نشر ۱۴۱۶ھ-۱۹۹۵م۔ رای العلماء الاعلام فی معانی الاستواء۔ ج ۵، ص ۵۱۔

[6] ذہبی۔ سیر اعلام النبلاء۔ ج ۱۰، ص ۴۹۴۔

[7] ابو عبید، قاسم بن سلام (م:۲۲۴ھ)۔ الاموال۔ الریاض: دار الہدی النبوی۔ ط اول: ۱۴۲۸ھ۔ ۲۰۰۷م۔ باب السنۃ فیما تجب فیہ الصدقۃ مما تخرج الارض۔ ج ۲، ص ۱۳۶۔

[8] ایضاً۔ ص ۱۳۱۔

[9] ایضاً۔ ص ۱۳۶۔

[10] ایضاً۔

[11] ابو داود، سجستانی، سلیمان بن اشعث (م: 275ھ) ۔ السنن۔ بیروت: دار الرسالۃ العالمیۃ، ط اول: ۱۴۳۰ھ ۔ ۲۰۰۹م۔ باب فی الصرف۔ حدیث نمبر: ۳۳۴۹۔ ج ۵، ص ۲۳۷۔

[12] وسق کے بارے میں تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ وہ ساٹھ صاع کا ہوتا ہے۔ حجازی صاع کے حساب سے ایک وسق کا وزن ۲۵ کلو گرام ۹۷۱ گرام اور ۲۰۰ ملی گرام بنتا ہے۔ عراقی صاع کے اعتبار سے ایک وسق ۵ من ۲ سیر ۸ چھٹانک یعنی ۱۸۸.۹۵۶ گرام بنتا ہے۔ (فاروق اصغر صارم۔ ص۶۹-۷۰)

[13] ابو عبید۔ الاموال۔ باب السنۃ فیما تجب فیہ الصدقۃ مما تخرج الارض۔ ج۲، ص۱۳۴۔

[14] ایضاً۔ ص۱۳۷۔

[15] ایضاً۔ ص۱۳۱۔

[16] ایضاً۔ ص۱۳۷-۱۳۸۔

[17] ایضاً۔ باب فتح الارض توخذ عنوۃً وہی من الفی والغنیمۃ جمیعاً۔ ج۱، ص۱۲۳۔

[18] ایضاً۔

[19] ایضاً۔

"اور جان لو کہ جو کچھ تمہیں ملے تو اس کا خمس (پانچواں حصہ) اللہ اور اس کے رسول اور قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔ (الانفال:۴۱)

[21] "جو کچھ اللہ تعالیٰ بستیوں کی آبادیوں میں سے اپنے رسول پر پلٹائے (فے بنادے (سو وہ اللہ کے لئے ہے اور رسول کے لئے اور قرابت داروں کے لئے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے تاکہ وہ (فے کا مال) تمہارے مال داروں کے درمیان ہی گردش میں نہ رہے اور جو کچھ تمہیں رسول دے اسے لے لو اور جس سے وہ تمہیں روکے تو اس سے رُک جاؤ۔ اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے (نیز یہ فے) ان فقیر مہاجروں کے لئے ہے جو اپنے گھروں اور اپنے اموال سے بے دخل کر دیے گیے ہیں اور جو اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں۔ یہی لوگ سچے ہیں (نیز ان لوگوں کے لئے (جو ان سے قبل مدینہ میں اقامت پذیر رہے اور ایمان پر جمے رہے۔ وہ اپنی طرف ہجرت کر کے آنے والوں سے محبت کرتے ہیں اور اپنے دلوں میں اس چیز کی کوئی خواہش نہیں پاتے جو وہ (مہاجرین) کو ترجیح دیتے ہیں خواہ وہ ضرورت مند ہی کیوں نہ ہوں، اور جو اپنے نفس کے حرص و بخل سے بچایا گیا تو یہی لوگ کامیاب ہیں۔ اور (نیز ان لوگوں کے لئے) جو ان کے بعد آئے۔ (الحشر:۷-۱۰)

[22] ابو عبید۔ الاموال۔ باب باب فتح الارض توخذ عنوۃً وہی من الفی والغنیمۃ جمیعاً۔ ج۱، ص۱۲۳۔

[23] ایضاً، ص۸۳۔

[24] ابو عبیدؒ نے اس روایت کو دوسری جگہ نقل کیا ہے جہاں مکتوب لکھنے کے الفاظ نہیں۔ (ابو عبید۔ الاموال۔ باب اخذ الجزیۃ من عرب اہل الکتاب۔ ج۱، ص۶۹)

اسی طرح ابن کثیر اور نسائی کی روایت میں بھی مکتوب کا ذکر نہیں۔ (ابن کثیر۔ السیرۃ النبویۃ۔ باب بعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خالد بن الولید۔ ج ۴، ص ۱۹۶)۔ (نسائی، ابو عبد الرحمن، احمد بن شعیب (م: ۳۰۳ھ)۔ السنن۔ حلب۔ مکتب المطبوعات الاسلامیۃ۔ ط دوم: ۱۴۰۶ھ–۱۹۸۶۔ باب زکاۃ البقر۔ حدیث نمبر: ۲۴۵۰۔ ج ۵، ص ۲۵)

[25] ابو داود۔ السنن۔ باب فی اخذ الجزیۃ۔ حدیث نمبر: ۳۰۴۱۔

[26] ائمہ حدیث اور اہل لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ ایک اوقیہ میں چالیس درہم ہوتے ہیں اور یہ اہل حجاز کا اوقیہ ہے۔ چالیس درہم کا وزن ۲ چھٹانک، ۶ ماشے کے برابر ہوتا ہے جو کہ ۱۲۲.۴۷ گرام وزن بنتا ہے۔ (فاروق اصغر صارم۔ اسلامی اوزان۔ ص ۲۱–۲۰)

[27] ابو عبید۔ الاموال۔ ج ۲، ص ۸۴۔

[28] امام بخاریؒ نے اسے تعلیقاً طاوس کے واسطے سے حضرت معاذؓ سے نقل کیا ہے۔ (بخاری، ابو عبد اللہ، محمد بن اسماعیل (م: ۲۵۶ھ)۔ الجامع المسند۔ دار طوق النجاۃ، ط اول: ۱۴۲۲ھ۔ باب العرض فی الزکاۃ۔ ج ۲، ص ۱۱۶۔)

جبکہ یحییٰ بن آدم نے اسے موصولاً ذکر کیا ہے۔ (یحییٰ بن آدم، ابو زکریا، کوفی (م: ۲۰۳ھ)۔ الخراج۔ المطبعۃ السلفیۃ ومکتبہا۔ ط دوم: ۱۳۸۴ھ۔ باب من قال: الصدقۃ فی الحنطۃ والشعیر والتمر والزبیب خاصۃ۔ حدیث نمبر: ۵۲۶۔ ص ۱۴۷)

[29] دار قطنی، ابو الحسن، علی بن عمر (م: ۳۸۵ھ)۔ السنن۔ بیروت: موسسۃ الرسالۃ۔ ط اول: ۱۴۲۴ھ - ۲۰۰۴م۔ باب لیس فی مال المکاتب زکاۃ حتی یعتق۔ حدیث نمبر: ۱۹۶۳۔ ج ۲، ص ۵۰۳)

[30] ابو عبید۔ الاموال۔ ج ۲، ص ۸۳–۸۵۔

[31] ایضاً۔ باب فروض زکاۃ الذہب والورق۔ ص ۷۵۔

[32] ایضاً۔

[33] ایضاً۔ ص ۷۸۔

[34] ایضاً۔ ص ۸۰۔

[35] ص ۷۱–۷۲۔

[36] بخاری۔ الجامع المسند۔ باب بیع الذہب بالذہب۔ حدیث نمبر: ۲۱۷۵۔ ج ۳، ص ۷۴۔

[37] ابو عبید۔ الاموال۔ ج ۲، ص ۷۲–۷۴۔

[38] یعنی یہ روایت کہ ربیعہ بن ابی عبد الرحمن متعدد علما (صحابہ کرامؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت بلال بن حارثؓ کو (حجاز کے مشہور علاقہ) قبلیہ کی کانیں (بہ طور جاگیر عطا فرمادی تھیں۔ یہ علاقہ مقام فرع کی جانب ہے، چنانچہ آج تک ان کانوں سے صرف زکات ہی لی جارہی ہے۔ (ابو عبید۔ الاموال۔ ج ۱، ص ۴۶۳)

[39] ابو عبید۔ الاموال۔ باب الخمس فی المعادن والرکاز۔ ج ۱، ص ۴۶۴۔

[40] احمد بن محمد بن حنبل، ابو عبد اللہ (م: ۲۴۱ھ)۔ المسند۔ بیروت: موسسۃ الرسالۃ۔ ط اول: ۱۴۲۱ھ۔ ۲۰۰۱م۔ مسند عبد اللہ بن عمرو۔ حدیث نمبر: ۶۶۸۳۔ ج ۱۱، ص ۲۷۴۔

[41] ابو عبید۔ الاموال۔ باب الخمس فی المعادن والرکاز۔ ج ا، ص ۴۵۶۔

[42] ایضاً۔ ص ۴۶۶۔

[43] ابو عبید۔ الاموال۔ ج ۲، ص ۲۳۵۔

[44] ایضاً۔ ص ۲۳۶۔

[45] ایضاً۔

[46] ایضاً۔ ص ۲۳۹۔

[47] ایضاً۔ ص ۲۴۰۔

[48] ایضاً۔ ص ۲۴۲۔